تقریظ و انتقاد

امہات الامہ

شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی یہ وہ مشہور کتاب ہے جس نے اب سے کئی سال پہلے ہندوستان میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ علمائے اسلام نے اس پر اتنا سخت احتجاج کیا کہ آخر کار اس کو جلا دینا پڑا۔ اس وقت سے یہ کتاب ناپید تھی اب مرحوم کے لائق پوتے جناب شاہد احمد صاحب ایڈیٹر رسالہ "ساقی" نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

مولف مرحوم کے متعلق ہم کو یہ معلوم ہے کہ وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان اور وسیع النظر عالم تھے ان کی تالیفات ان دونوں باتوں پر گواہ ہیں۔ ان کی نیک نیتی بھی اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سے دشمنوں کے اعتراضات رفع کرنے کی کوشش کی اور خود مسلمانوں میں جو لوگ اسلامی تعلیمات میں شکوک رکھتے تھے ان کو مطمئن کرنے کے لیے بارہا اپنی قوت تحریر و تقریر کو استعمال کیا۔ امہات الامہ بھی انھوں نے اسی نیت سے لکھی تھی کہ دشمنوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی اور تعدد ازدواج پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کو رفع کریں۔ پس جہاں تک ان کی نیت کا تعلق ہے اس پر کسی قسم کا شبہہ کرنے کی گنجائش نہیں۔ ان کے حق میں یہ بدگمانی کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ انھوں نے قصداً حملہ کرنے کی نیت سے اسلام کی مقدس ترین شخصیتوں میں سے کسی پر حملہ کیا ہوگا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے نیک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا اس میں سخت غلطیاں کیں اور حد اعتدال سے اس قدر تجاوز کر گئے کہ بعض اوقات حسن نیت

کی رعایت ان کی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو نظر انداز کر کے ہم صرف اس حصے پر نظر ڈالیں گے جس میں مؤلف نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سیرت بیان کرتے ہوئے ضمناً خلافت کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کے مسئلہ میں جو اختلاف برپا ہوا اور جس کی وجہ سے آخر کار مسلمانوں میں دو فرقے پیدا ہو گئے، اس کی بنیاد مولوی نذیر احمد صاحب کے نزدیک وہ "منافست" ہے جو آنحضرت کے حین حیات ہی سے حضرت فاطمہ رضی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے درمیان قائم تھی (ص ۹۶)۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت فاطمہ رض کو اپنی والدۂ ماجدہ کی خدمات پر جو ناز تھا اس کی وجہ سے وہ حضرت عائشہ رض کو اپنا ہمسر نہ گردانتی تھیں۔ دوسری طرف حضرت عائشہ رض کو اپنے والد ماجد حضرت ابو بکر رض کی ان خدمات پر ناز تھا جن پر خود حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے علی رؤس الاشہاد اظہار ممنونیت فرمایا۔ اس بنا پر فاضل مؤلف نے پہلا نظریہ قائم فرمایا کہ

"دونوں میں منافست کے اسباب موجود تھے، اور منافست تھی بھی۔"

اس کے بعد وہ خلافت کے "دو بڑے امیدواروں" یعنی حضرت ابو بکر رض اور حضرت علی رض کی طرف بڑھتے ہیں، اور یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ یہ دونوں بھی اپنی اسلامی خدمات اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قریبی تعلق کی بنا پر خلافت کے مدعی تھے، اور ان دونوں میں پہلے سے "نہفتہ رقابت" اور "دلی کدورت" تھی۔ کدورت کے ثبوت میں مؤلف نے واقعہ افک کو پیش کیا ہے جس میں حضرت علی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ "خدا نے آپ پر بیویوں کے معاملہ میں تنگی نہیں کی ہے" مصنف کی رائے میں حضرت علی کا مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلعم حضرت عائشہ کو طلاق دیدیں، اور یہ مشورہ حضرت علی نے اُس دشمنی کی بنا پر دیا تھا جو ان کو حضرت ابو بکر رض سے تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس واقعہ نے دونوں بزرگوں میں منافست کو ترقی دیکر محاسدہ کی حد تک پہنچا دیا۔

اس کے بعد جناب مولف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس خیال کا اظہار فرماتے ہیں کہ :-

"خود پیغمبر صاحب کو بھی مشکل درپیش تھی۔ انہوں نے بھی خلافت کے بارے میں کبھی صاف طور پر دو ٹوک بات نہ فرمائی جیسی توحید کے بارے میں لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ ہاں ضرورت پڑنے پر ہر ایک کے استحقاق کا اعتراف کرتے تھے۔"

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خلافت کا تصفیہ کر دینا ضروری تھا، مگر امت کی اس ضرورت کو پورا کرنے سے جس چیز نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا، وہ صرف یہ بات تھی کہ ایک طرف بیٹی کی محبت تھی اور دوسری طرف بیوی کی محبت۔ یہ ایک کھلی ہوئی اخلاقی کمزوری ہے جس کو مولف نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

اس سلسلہ میں مولف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے واقعۂ قرطاس کو اس انداز سے بیان کیا ہے :-

"سب سے پہلے واقعۂ قرطاس نے بھانڈا پھوڑا کہ اول دن سے رکا دلوں کی کھچڑی خلافت کے لیے پک رہی تھی۔ خلافت کے سوائے اور کون سا ایسا ضروری مطلب ہو سکتا تھا جس کے لیے احتضار کی حالت میں صورت سوال بن کر پیغمبر صاحب کو وصیت کی تکلیف دی جائے۔ بات پھر بھی گول مول رہی علیؓ نے سامنے جا کھڑے ہونے کے سوائے منہ سے کچھ نہ کہا پیغمبر صاحب نے بھی اس وصیت کی جس کے لیے کاغذ منگواتے تھے کچھ صراحت نہ فرمائی کہ کیا لکھوانا چاہتے تھے مگر جن کے دل میں متائے خلافت چٹکیاں لے رہی تھی انہوں نے تو دھینگا مشتی سے منصوبے ہی کو چٹکیوں میں اڑا دیا اور مزاحمت کی تاویل یہ کی کہ ہماری ہدایت کے لیے قرآن بس کرتا ہے" (ص ۱۰۰)۔

اس فقرے میں حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ دونوں پر جو حملہ کیا گیا ہے وہ اتنا صریح ہے کہ اس کو کسی تاویل سے نہیں چھپایا جا سکتا۔

اس کے بعد اہل بیت کرام پر حملہ کیا گیا ہے کہ :۔

"انہوں نے رزق مقسوم پر قناعت نہ کرکے گوشۂ عافیت سے پاؤں باہر نکالے اور خواہ مخواہ دعوئے خلافت کر بیٹھے ..... ان کا حال کیا تھا کہ ان میں سے جب کسی کے پاس ہزار پانسو آدمیوں کی جمعیت فراہم ہوئی لگا سلطنت کے خواب دیکھنے۔ ملک گیری کی ہوس میں علم خلافت اونچا کیا، خلیفۂ وقت پر خروج کرکے ساتھیوں کو ناحق مروا دیا اور آخر کار خود بھی لڑائی میں مارڈالا گیا یا پکڑا آیا، قید کیا گیا یا زہر دے کر مار ڈالا گیا۔ خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ... اسلام کے حق میں یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ پیغمبر صاحب کی اولاد ذکور ان کے بعد زندہ نہ رہی بیٹیوں میں ایک بیٹی زندہ رہی تو ان کی نسل کی بدولت اسلام میں یہ تفرقہ پڑا کہ مسلمان سنی اور شیعہ دو فریق ہو گئے جن میں ہمیشہ جوتیوں میں دال بٹتی رہتی ہے۔ بیٹا زندہ رہتا تو شاید پسر نوح ثابت ہوتا۔" (ص ۱۰۲)۔

اس فقرے کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ امام حسنؓ اور امام حسینؓ سے لے کر آخر تک اہل بیت میں سے جس کسی نے خلافت کا دعوی کیا اس کے پیش نظر محض سلطنت کی ہوس تھی اور کسی بلند تر مقصد کا شائبہ تک نہ تھا۔ ادب اور بزرگداشت کو جانے دیجئے۔ تاریخ ہی کے اعتبار سے کیا یہ درست ہے؟ پھر قیاس آرائی کی حد یہ ہے کہ جناب مؤلف فرض کر لیتے ہیں کہ اگر آنحضرت کا بیٹا زندہ رہتا تو "شاید پسر نوح ثابت ہوتا۔" قطع نظر اس کے کہ اہل بیت کے حق میں یہ انداز بیان حد درجہ گستاخانہ اور خلاف حقیقت ہے ہم پوچھتے ہیں کہ آنحضرت کے متوفی بیٹے کے حق میں جو قیاس انہوں نے قائم کیا ہے اس کے لیے مجرد بدگمانی کے سوا اور کیا بنیاد ہو سکتی ہے۔

اہل بیت اور بنو امیہ و بنو عباس کے درمیان جو خونریزیاں ہوئیں ان کو بیان کرنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں :-

"وہ عورتوں کی ضد نے (اور ضد بھی کھانے کی نہیں کپڑے کی نہیں خرچ پات کی نہیں سلوک مدارات کی نہیں خیالی برتری کی) کیا طول پکڑا ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس ہونے کو آئے اور یہ جھگڑا طے نہ ہوا" (ص ۱۰۶) -

پھر اس سلسلہ میں حضرت فاطمہؓ کے دعوائے فدک اور اس کے فیصلہ پر ان کے ناراض ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"کس بلا کا غصہ ہے، خدا کی پناہ۔ ادھر فاطمہ ایک سیر کی تھیں کہ مرتے مرگئیں اور اپنی آن نہ چھوڑی تو ادھر عائشہ سوا سیر کی کہ فاطمہ جواں مرگ مرگئی تھیں۔ علی کا سارا گھمنڈ فاطمہ کے مرنے سے کرکرا ہو گیا تھا اور ہارے درجہ پس خورد وہ خلافت ان کو نصیب ہوا تھا وہ بھی ادھورا کہ عراق اور شام کے لوگ علی کی خلافت سے راضی نہ تھے پھر بھی عائشہ علی کو نیچا دکھانے کی تاک میں تھیں۔ علی مسند خلافت پر جم کر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ قاتلان عثمان کا قصاص لینے کی غرض سے علی پر فوج کشی کر بیٹھیں گویا علی نے عثمان کو قتل کیا یا کرایا ہے ہمارے ملک میں عورتوں کا ایک طبعی خاصہ تریاہٹ اور ایک تریا چرتر بھی مانا گیا ہے تو وہی بات ہم فاطمہ اور عائشہ میں پاتے ہیں فاطمہ تو انتقال فرما گئیں اور ان کی ہٹ بھی تم نے دیکھ لی۔ اب رہ گئیں عائشہ تو ان کا ایک چرتر تو یہ تھا....."

اس کے بعد نعوذ باللہ حضرت عائشہؓ کے "چرتر گنائے ہیں" اور اپنے دعوے کی تائید میں جو ثبوت پیش کیا ہے وہ اس قدر لغو ہے کہ اس پر بحث کرنا بالکل لاحاصل معلوم ہوتا ہے۔

آگے چل کر حضرت عثمان پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ان کے حق میں مولانا کا فتویٰ یہ ہے کہ:-

"عثمان اپنی بے جا او نکما نہ اور خودسرانہ کارروائیوں کی وجہ سے قتل کے تو نہیں عزل کے مستوجب ضرور تھے"۔

ہم نے ان تمام ناشائستہ فقروں کو دلی کراہت کے باوجود صرف اس لیے نقل کیا ہے کہ کوئی شخص ہم کو مولوی نذیر احمد صاحب کے حق میں بے انصافی کا الزام نہ دے۔ خود مولوی صاحب کی تحریروں سے یہ چند نمونے پیش کرنے کے بعد ہم پوری کتاب کے متعلق اپنی رائے مختصر الفاظ میں لکھ دیتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی غلطی یہ ہے کہ ایک ایسی کتاب میں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی اور تعدد ازواج پر عیسائی پادریوں کے اعتراضات رفع کرنے کے لیے لکھی گئی تھی ان مباحث کی قطعاً ضرورت نہ تھی جن کو مولوی صاحب نے خواہ مخواہ چھیڑ دیا ہے۔

۲۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ازواج مطہرات اور صحابہ کرام کی سیرت اس زبان میں لکھی ہے جو مراۃ العروس اور بنات النعش ہی کے لیے موزوں ہو سکتی تھی۔ مولف میں یہ سلیقہ نہ تھا کہ ہر موضوع کے لحاظ سے اس کے مناسب زبان اختیار کرتے۔ بزرگان دین کے احوال میں وہ زبان استعمال کرنا جو ناولوں میں استعمال کی جاتی ہے خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی جائز نہیں، کجا کہ مذہبی نقطۂ نظر سے یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ ان کے فقرے نظروں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتے ہیں، اور بعض مقامات پر تو زبان کا پھوہڑپن اس قدر حد سے گذرا ہوا نظر آتا ہے کہ بے اختیار کتاب ہاتھ سے پھینک دینے کو جی چاہتا ہے۔

۳۔ مولف کی نیت نیک ہی سہی مگر انہوں نے یہ کتاب لکھ کر وہ کام کیا ہے جو ایک دشمن اسلام کو کرنا چاہیے تھا انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور آپ کے سب سے زیادہ مقرب صحابیوں کا وہ کیرکٹر پیش کیا ہے جو کسی حیثیت سے بھی ادنیٰ درجہ کے نفس پرست لوگوں سے ممتاز نہیں وہی ضد نفسانیت ہوس جاہ اور اپنی ذاتی اغراض کیلئے حق و ناحق کی پروا نہ کرنا جو ہم پست ترین اخلاق کے لوگوں میں دیکھتے ہیں مولوی نذیر احمد صاحب نے اسی کو ان لوگوں کی سیرتوں میں نمایاں کر کے دکھایا ہے جنھوں نے خاص رسول اللہ صلعم سے اسلامی اخلاق کی تعلیم و تربیت پائی تھی اور جن کے کندھوں پر آنحضرت کے

بعد دنیا میں اسلام کو پھیلانے کا بار ڈالا گیا تھا۔ اگر یہ لوگ فی الحقیقت ویسے ہی ہوتے جیسا مولوی نذیر احمد صاحب نے ان کو سمجھا ہے تو قسم بخدا کہ اسلام ہرگز مدینہ سے چل کر دلی تک نہ پہنچتا اور نہ تیرہ صدیوں تک قائم رہتا۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپ کی تعلیم و تربیت کے باوجود ان لوگوں کے اخلاق ایسے ہی تھے جیسے مولوی صاحب نے بیان کئے ہیں تو نعوذ باللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مشن میں قطعاً ناکام ہوئے۔ اگر یہ لوگ عہد جاہلیت کے کسی عرب سردار کے اقربا و اصحاب ہوتے تو کیا ان سے انہی اخلاق اور افعال کا صدور نہ ہوتا جو مولوی نذیر احمد صاحب نے بیان کیے ہیں؟ پھر اخلاق کے اعتبار سے جاہلیت اور اسلام میں فرق ہی کیا باقی رہا؟ اور وہ کون سی اصلاح اخلاق ہے جس پر اسلام فخر کرسکتا ہے؟

۴۔ مولوی نذیر احمد صاحب نے صحیح اور معتبر تاریخی واقعات کو صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان پر قیاسات کی ایک بڑی عمارت تیار کی ہے، اور افسوس یہ ہے کہ ان کے تمام قیاسات ایسے ہیں کہ اگر کوئی غیر مسلم مورخ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل بیت اور اصحاب سے سخت بدگمانی رکھتا ہو، ان واقعات پر قیاس آرائی کرتا تو شاید اس سے زیادہ بدتر قیاس آرائی نہ کرسکتا۔ ہر واقعہ کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اچھا اور ایک برا۔ دوست اچھا پہلو اختیار کرتا ہے۔ اور دشمن برا پہلو۔ بدقسمتی سے مولوی نذیر احمد صاحب نے برا پہلو اختیار کیا اور صحابہ و اہل بیت رسول کے ہر فعل میں ان کو بدنیتی اور دنائت اخلاق ہی نظر آئی۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہماری رائے میں امہات الامہ ہرگز اس قابل نہ تھی کہ اسے دوبارہ شایع کیا جاتا۔ مولوی نذیر احمد صاحب کو ایک عالم اور انشا پرداز کی حیثیت سے جو شہرت حاصل ہے اس میں یہ کتاب کوئی اضافہ نہیں کرتی بلکہ اس کو بٹہ لگاتی ہے۔ مرحوم سے آخری عمر میں ایک غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ مناسب تھا کہ اس پر پردہ پڑا رہنے دیا جاتا۔ ان کے پوتے نے کچھ اچھا نہ کیا کہ اپنے دادا کی غلطی کو پھر ایک مرتبہ منظر عام پر لے آئے۔